

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی کا ترجمان

ستہ ماہی
تحقیقاتِ اسلامی
علی گڑھ

اپریل ————— جون ۲۰۰۵ء

مدیر
سیّد جلال الدین عمری
معاون مدیر
محمد رضی الاسلام ندوی

پانے والے کوٹھیے دو دم پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲
پوسٹ بکس ۹۳

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد ۲۴
شمارہ ۲:
ربیع الاول _____ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
اپریل _____ جون ۲۰۰۵ء

زیرِ تعاون

انڈرون ملک

۲۵ روپے فی شمارہ
۱۰۰ روپے سالانہ
۱۲۵ روپے سالانہ (لابھریاں و ادارے)

بیرون ملک

۴۰۰ روپے سالانہ انفرادی
۶۰۰ روپے سالانہ ادارے

پاکستان

۲۰۰ روپے سالانہ انفرادی
۳۰۰ روپے سالانہ ادارے

طابع و ناشر سید جلال الدین عمری نے دعوت آفسٹ پرنٹرز دہلی۔ ۶۔ سے چھپوا کر
ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، پان والی کوشی، دودھ پورٹی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

- ۵ سید جلال الدین عمری
پاکستان کا سفر
(دو ہفتوں کی خوش گوار یادیں)

تحقیق و تنقید

- ۳۱ پروفیسر کبیر احمد جاسی
تفسیر شاہی
- ۵۶ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی
شاہ ولی اللہ کا رسالہ ”علیہ الانصاف“
- ۶۶ پروفیسر احتشام احمد ندوی
مالا بار میں اسلام (ایک تاریخی جائزہ)

بحث و نظر

- ۸۵ مولانا سلطان احمد اصلاحی
سیاستِ عادلہ (۲)

سیر و سوانح

- ۱۰۶ مولانا اشہد رفیق ندوی
شیخ احمد سرہندی کے تجدیدی کارنامے

تعارف و تبصرہ

- ۱۱۸ محمد رضی الاسلام ندوی
علامہ شبلی نعمانیؒ کی قرآن فہمی
- ۱۱۸ “ “ “
ہندو علماء و مفکرین کی قرآنی خدمات
- ۱۱۹ “ “ “
وحیِ حدیث

اس شمارے کے لکھنے والے

- ۱۔ پروفیسر کبیر احمد جاسی
ساجدہ منزل، اقر کالونی، علی گڑھ
سابق ڈائریکٹر ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- ۲۔ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی
ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- ۳۔ پروفیسر احتشام احمد ندوی
مدینہ منزل، نیوسر سیدنگر، علی گڑھ (سابق صدر شعبہ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا)
- ۴۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی
رکن ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ
- ۵۔ مولانا اشہد رفیق ندوی
استاد سینیور سیکنڈری اسکول، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- ۶۔ محمد رضی الاسلام ندوی
رکن ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ
- ۷۔ سید جلال الدین عمری
صدر ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ

پاکستان کا سفر

(دو ہفتوں کی خوش گوار یادیں)

سید جلال الدین عمری

ایک طویل عرصے سے پاکستان جانے، وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے اور دوستوں اور رفیقوں سے ملاقات کی خواہش دل میں موج زن تھی، لیکن ہر خواہش کا پورا ہونا اور جس وقت ہم چاہتے ہیں اس وقت پورا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دو پڑوسی ملک ہیں، لیکن ان کے درمیان سفر آسان نہیں رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کے سرد و گرم تعلقات بھی ہیں۔ ان تعلقات میں اس قدر نشیب و فراز رہا کہ کبھی سفر کا ارادہ ہوتا اور کبھی ٹوٹ جاتا۔ ایک مرتبہ ویزا بھی مل گیا اور میں نے سفر کی تیاری شروع کر دی، لیکن اسی اثنا میں کارگل کا محاذ کھل گیا اور دونوں ملکوں کے حالات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ سفر ملتوی کرنا پڑا۔ اب بظاہر حالات میں تبدیلی آئی ہے اور بہ آسانی آمد و رفت شروع ہو گئی ہے۔ بہر حال بہت تاخیر سے سہی اس عاجز کے پاکستان جانے کی صورت نکل آئی۔ ۱۹/۲۰/۲۱ مارچ ۲۰۰۵ء کو یمن الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں اجتماعی اجتہاد کے موضوع پر سیمینار تھا۔ اس میں شرکت کا دعوت نامہ محترم ڈاکٹر طاہر منصور، صدر شعبہ قانون کی جانب سے موصول ہوا اور میں نے دعوت قبول کر لی۔ سفارت خانہ پاکستان کو ایک دوست نے میرے ارادے کی اطلاع اور ویزا کی درخواست دی۔ سفارت خانہ نے بخوشی اسے منظور کر لیا۔ میں نے پاسپورٹ بھیج دیا اور ویزا مل گیا۔ پولیس رپورٹنگ سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس کے لیے میں سفارت خانہ پاکستان کا مشکور ہوں۔ سیمینار میں شرکت کے لیے اسلام آباد جانا ہی تھا۔ اس کے ساتھ پاکستان کے دو بڑے علمی، تہذیبی اور سیاسی مراکز لاہور اور کراچی کو بھی میں نے اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ سفر کی پہلی منزل لاہور تھی۔

میراٹکٹ پی آئی اے (PIA) سے تھا۔ ۱۲ مارچ ۲۰۰۵ء کی شام کو 5:30 بجے روانگی تھی۔ لیکن کسی قدر تاخیر سے جہاز روانہ ہوا۔ پچاس منٹ کی پرواز کے بعد پاکستانی وقت کے لحاظ سے 7:30 بجے جہاز لاہور پہنچا۔ لاہور کا نیا ہوائی اڈہ بہت وسیع، خوب صورت اور صاف ستھرا ہے۔ میرے ساتھ سامان بہت کم تھا۔ کسٹم والوں نے بھی تفتیش نہیں کی۔ خوشنما رہی کہ سامان نہ دارد۔

ایر پورٹ سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران تھا کہ ایک بندہ عاجز و ناتواں کے استقبال کے لیے حافظ محمد ادریس صاحب ناظم اعلیٰ ادارہ معارف اسلامی، جناب اشرف ملک اعوان صاحب نائب قیم جماعت اسلامی پاکستان، جناب عبدالغفار عزیز صاحب ناظم امور خارجہ جماعت اسلامی پاکستان طلبہ کے ساتھ موجود ہیں۔ ان سب حضرات سے پہلی ملاقات تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہر طرف سے محبت اور اخلاص کے پھول برس رہے ہوں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی دوستوں سے تفصیلی تعارف شروع ہو گیا۔ ایئر پورٹ سے قیام گاہ کا فاصلہ ایک گھنٹہ میں طے ہوا۔ قیام گاہ پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اطلاع ملی کہ ایک اسلام پسند نوجوان کا ولیمہ ہے۔ اس میں شرکت اس کے لیے بھی اور اس کے عزیزوں کے لیے بھی خوشی کا باعث ہوگی۔ اس نوجوان کی شادی ایک ترک لڑکی سے ہوئی ہے۔ ولیمہ کی اس تقریب میں محترم قاضی حسین احمد صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان، نائب امراء چودھری رحمت الہی صاحب اور چودھری محمد اسلم صدیقی صاحب اور بعض دیگر ذمہ دار حضرات بھی شریک تھے ان سب سے غائبانہ واقفیت تو تھی ہی اب براہ راست تعارف کا موقع ملا۔ گویہ ملاقات تھوڑی دیر کے لیے تھی لیکن فطری طور پر اس سے خوشی محسوس ہوئی۔

۱۳ صبح ادارہ معارف اسلامی لاہور میں حاضری دی، حافظ محمد ادریس صاحب نے تفصیل سے ادارہ کا تعارف کرایا۔ یہ ایک علمی ادارہ ہے۔ جہاں ریسرچ اور تحقیق کی ضروری سہولتیں موجود ہیں۔ اس کی اپنی لائبریری ہے۔ ریسرچ اسکالرز اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ تحقیقی کاموں میں ان کی مدد بھی کی جاتی ہے۔ ان کے تحقیقی مقالے یہاں جمع ہوتے ہیں۔ اسی سے متصل ترجمان القرآن کا دفتر ہے۔ ترجمان القرآن پاکستان کا ایک معتبر

دینی و علمی رہنما ہے۔ اس رسالے کے ساتھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی یادداشت ہے۔ اس نے امت کے ذہن و فکر کی تعمیر میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی ادارت کے فرائض کئی سال سے عالم اسلام کی معروف شخصیت پروفیسر خورشید احمد صاحب انجام دے رہے ہیں۔ معروف اسلامی مفکر اور مصنف، محترم جناب خرم مراد مرحوم کے برادر خورد جناب مسلم سجاد صاحب اس کے نائب مدیر ہیں۔ ان سے بار بار ملاقات رہی اور ان کی نیک نفسی اور خلوص کے نقوش دل پر ثبت ہوتے رہے۔ یہیں قریب ہی پروفیسر نصیر الدین ہمایوں نائب صدر تنظیم اساتذہ پاکستان کی قیام گاہ ہے۔ ان کا شمار تعلیمات کے ماہر اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ اسلام آباد میں بھی ان کی رفاقت حاصل رہی۔

قریب ہی مکتبہ معارف اسلامی لاہور ہے۔ اسے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میری کتاب 'عورت اسلامی معاشرے میں' کا پندرہواں ایڈیشن مکتبہ اسلامی پبلیشرز نے دو سال قبل شائع کیا ہے۔ ہندوستان سے اس کے گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ میری بعض اور کتابوں کے بھی چار پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر کتابیں مکتبہ اسلامی پبلیشرز سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ جس مکتبہ نے جو کتاب شائع کرنی چاہی، شائع کر دی۔ مجھے اس کی اطلاع تک نہیں دی۔ اب بعض مکتبے ان کتابوں کو زیادہ اہتمام سے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔

بعد نماز عصر پانچ بجے جماعت اسلامی لاہور نے اپنے دفتر میں استقبال کا نظم کیا تھا۔ تین چار سو افراد جمع تھے۔ اسٹیج پر ملک محمد اشرف اعوان، حافظ سلیمان بٹ وغیرہ ذمہ دار افراد موجود تھے۔ ملک محمد اشرف اعوان صاحب نے عاجز کا تعارف کرایا اور خطاب کی دعوت دی۔ میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات اور جماعت کی خدمات کا تعارف کرایا۔ میں نے بتایا کہ اس وقت برصغیر میں جماعت اسلامی کے نام سے پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور کشمیر میں جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ ان سب کا نصب العین گوا قامت دین ہے لیکن ان کے درمیان کسی قسم کا تنظیمی ربط نہیں ہے۔ ہر جماعت کا اپنے حالات کے لحاظ سے نقشہ کار ہے اور وہ اس پر عمل کرتی ہے۔ جماعت اسلامی ہند نے

اپنے لیے جو طریقہ کار تجویز کیا ہے اس میں اسلام کا تعارف اور اس کی دعوت، مسلم معاشرے کی اصلاح، تعلیم کی توسیع اور خدمت خلق کے کاموں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اپنے کارکنوں کی تربیت و اصلاح پر بھی خاص توجہ دیتی ہے۔

تقریر کے بعد پریس والوں نے سوال و جواب شروع کر دیے۔ اہل پاکستان کو ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی، تہذیبی حالات سے خاص دلچسپی ہے۔ وہ مسلمانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ غیر مسلم سیاسی جماعتوں اور مسلمانوں کے سلسلے میں ان کا رویہ ان کے سوالات میں شامل ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کے متعلق بھی وہ سوالات کرتے ہیں۔ ان کا خاص موضوع مسئلہ کشمیر ہے جس کے بارے میں ہر موقع پر سوال کیا جاتا ہے۔ میں نے ہندوستانی نظام، اس کے دستور، اس میں اقلیتوں کے حقوق، موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل کی کوششوں کا مختصر سا ذکر کیا۔ مسئلہ کشمیر کے بارے میں بتایا کہ یہ برصغیر کا پچاس سال سے زیادہ قدیم اور پے چیدہ مسئلہ ہے۔ اس کا حل ہم سب چاہتے ہیں، لیکن یہ حل بات چیت اور گفتگو ہی کے ذریعہ نکلنا چاہیے، جنگ اس کا حل نہیں ہے۔ اس مسئلے پر تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اب جنگ ہوگی تو بڑی تباہ کن ہوگی، اس لیے کہ اب یہ دونوں ایشیائی ملکوں کے درمیان جنگ ہوگی۔ اس سے دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ ان دونوں ممالک کو ایسا پر امن حل تلاش کرنا چاہیے جو کشمیریوں کے لیے بھی قابل قبول ہو۔

لاہور کے بیشتر اخبارات نے جن میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے اخبارات شامل ہیں، اس عاجز کی لاہور آمد اور سوال و جواب کو نمایاں طریقہ سے شائع کیا۔ لیکن افسوس کہ بعض باتوں کی صحیح رپورٹنگ نہیں ہو سکی۔ پاکستان کی اردو صحافت کا معیار ہندوستان کی اردو صحافت سے بلند ہے۔ دہلی، اتر پردیش اور بہار جو اردو کے مراکز ہیں یہاں کی اردو صحافت نیم جان بلکہ بے جان ہو کر رہ گئی ہے۔ بمبئی اور حیدرآباد کے اخبارات اپنا ایک معیار رکھتے ہیں۔ پاکستان کے اردو اخبارات کا معیار وہاں کے انگریزی اخبارات سے کم نہیں ہے۔ ان کی اشاعت انگریزی اخبارات سے زیادہ ہے۔ البتہ گندگی اور بے حیائی کی اشاعت

ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ مشترک ہے۔ بہت کم اخبارات اس سے محفوظ ہیں۔

استقبالیہ سے فارغ ہو کر ملک محمد اشرف اعوان صاحب کے ساتھ اچھرہ پہنچا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی قبر پر حاضری دی۔ مولانا کو میں نے نہیں دیکھا لیکن ان سے فکری رہنمائی حاصل کی ہے اور ان کے علم و فہم اور بصیرت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ اس دور میں اسلام کے بے باک ترجمان اور بہترین شارح تھے۔ انہوں نے احیاء اسلام کا جذبہ بیدار کیا۔ یہ جذبہ آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ وہ جب تک زندہ رہے بہت سے دلوں کی دھڑکن بن کر رہے اور جب دنیا سے گئے تو اپنا ذکر خیر چھوڑ گئے۔ میں نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس خادمِ دین کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزہ نورستہ اس گل کی نگہبانی کرے

مولانا مرحوم کی قبر ہی کے قریب بیگم مودودیؒ کی بھی قبر ہے۔ اس اللہ کی بندی نے جس طرح ہر نشیب و فراز میں مولانا کا ساتھ دیا اور حقِ رفاقت ادا کیا وہ خود ایک مثال ہے۔ مولانا جس آفس میں بیٹھتے تھے، رات ہونے کی وجہ سے وہ بند تھا، مولانا کے صاحب زادوں سید حیدر فاروق مودودی اور سید حسین مودودی سے تھوڑی دیر ملاقات رہی۔ اس کے بعد قیام گاہ واپسی ہوئی۔

۵ مارچ کا دن بھی بڑی مصروفیت کا رہا۔ صبح مولانا مودودیؒ انسٹی ٹیوٹ دیکھا اور وہاں کے طلبہ سے خطاب کیا۔ یہاں ہائی اسکول پاس طلبہ کے لیے دینی تعلیم کا دو سالہ کورس ہے۔ ذریعہ تعلیم انگریزی اور عربی ہے۔ طلبہ نے مختصر سا پروگرام پیش کیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ ان زبانوں میں اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ طلبہ کے پروگرام کے بعد مجھ سے خطاب کی فرمائش ہوئی تو میں نے اس بات پر زور دیا۔

بچے علم چوں شمع باید گداخت

کہ بے علم نہ تو اس خدارا شناخت

علم کی راہ میں ہمارے اسلاف کی محنت اور کدو کاوش کی بعض مثالیں پیش کیں اور

کہا کہ ادارہ جن اعلیٰ مقاصد کے لیے قائم ہوا ہے، اساتذہ اور طلبہ انہیں ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔
جامعۃ المحسنات کے نام سے پاکستان میں دس گیارہ ادارے قائم ہیں۔ یہ ایک
ٹرسٹ کے تحت چلائے جا رہے ہیں۔ اس کا تعلیمی نظام رابطہ المدارس بورڈ کے تحت ہے۔
کم از کم میٹرک پاس طالبات کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ جو طالبات انگلش میں انٹر (F.A) کرنا
چاہتی ہیں ان کے لیے اس کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ یہ ادارے ابھی ابتدائی مرحلے
میں ہیں۔ آگے کے مراحل پر عمل درآمد ہو تو اسلامی جذبات سے معمور طالبات تیار ہو سکتی
ہیں۔ یہاں کی معلمات اور طالبات سے خطاب کا موقع ملا۔ جماعت اسلامی ہند تعلیم کے
میدان میں کافی آگے ہے۔ اس کے اراکین اور کارکنوں کے ذریعہ خواتین کی دینی تعلیم کے
متعدد ادارے چل رہے ہیں اور بڑی جامعات بھی موجود ہیں۔

بعد مغرب (6:30) ادارہ معارف اسلامی لاہور کی طرف سے مختصر علمی نشست کا اہتمام
تھا۔ اس کے لیے دعوت نامے جاری کیے گئے تھے۔ لیکن توقع سے زیادہ افراد نے شرکت
کی۔ اس عاجز نے اپنے اظہار خیال میں عرض کیا۔ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ مادیت کا
غلبہ ہے۔ مادیت انسان کے فکرو عمل، تہذیب و تمدن، معیشت و سیاست ہر چیز پر چھائی ہوئی
ہے۔ مذہب و اخلاق بھی اس کے تابع ہو کر رہ گئے ہیں۔ آدمی اس سے اوپر اٹھ کر سوچنے
کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ صورت حال بڑی بھیانک ہے لیکن نئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے
رسولوں کو اسی صورت حال سے سابقہ پیش آتا رہا ہے۔ محمد ﷺ کی جب بعثت ہوئی تو دنیا اسی
مادیت میں گرفتار تھی۔ اس کی وجہ سے ہر طرف ظلم و استحصال تھا، حقوق پامال ہو رہے تھے،
اور سماج عدل و انصاف سے محروم تھا۔ محمد ﷺ نے یہ حقیقت واضح کی کہ اس بگاڑ کی اصل وجہ
خدا اور رسول کا انکار اور آخرت فراموشی ہے۔ اگر خدا کا تصور واضح ہو، انسان اس کی ہدایت کو
تسلیم کرے اور یہ بات مان لے کہ آخرت کی کامیابی اور ناکامی ہی اصل ہے تو وہ مادیت کی
دلدل سے نکل سکتا ہے۔ دنیا ظلم سے پاک ہو سکتی اور نظام حیات امن و امان اور عدل و
انصاف پر قائم ہو سکتا ہے اور اس کی آخرت بھی سنور سکتی ہے۔ یہی کام آج کرنے کا ہے۔

تقریر کے بعد تھوڑی دیر سوال و جواب کا سلسلہ رہا۔ اس مجلس کی رپورٹ

پاکستان کے سینئر صحافی اور مشہور کالم نگار عطاء الرحمن صاحب نے روزنامہ نوائے وقت میں شائع کی۔ اس کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں:

”مولانا جلال الدین عمری، جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر اور مسلمانان بھارت کی سربراہ اور وہ علمی شخصیت، اسلام اور دور حاضر کو درپیش مسائل سے متعلق کئی موضوعات پر علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ علی گڑھ سے شائع ہونے والے سہ ماہی (مجلد) ’تحقیقات اسلامی‘ کے مدیر اور اعظم گڑھ میں قائم ممتاز درس گاہ جامعۃ الفلاح کے شیخ الجامعہ بھی ہیں۔ یوں ان کی ذات میں علم، تحقیق، تعلیم و تدریس اور توسیع علم کے اوصاف جمع ہو گئے ہیں۔ مولانا جلال الدین عمری ان دنوں اسلام آباد کے سرکاری ادارے تحقیقات اسلامی کے زیر اہتمام اجتہاد پر ہونے والی عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ گزشتہ شب ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور نے ان کے ساتھ نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔ مولانا عمری نے بیس منٹ تک خطاب کیا پھر چتے تلے انداز میں سوالات کے جواب دیے۔ سید منور حسن میر محفل تھے، مولانا محمد ادریس مہتمم کے فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ مولانا جلال الدین عمری نے آغاز کلام کیا، گویا دبستان کھل گیا۔ ایک مدت کے بعد گزرا اور جہنا میں دھلی ہوئی زبان سننے کا اتفاق ہوا۔ پچھلے ہفتے اسلام آباد میں اردو ہے جس کا نام کے زیر عنوان ایک عالمی کانفرنس ہوئی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق بڑے بڑے ادیب اور شعراء شریک ہوئے۔ زبان و کلام اور اظہار کے مختلف پہلو اور نت نئے اسالیب اس میں سامنے آئے ہوں گے، لیکن مولانا عمری کا لہجہ، طرزِ تکلم، الفاظ کا انتخاب، ان کی ادیبانہ اس پر مستزاد مسلمانانِ یوپی و دہلی کی تہذیبی روایات کی انعکاسی کرنے والی وضع قطع سب نے مل کر ایسا سماں باندھا کہ گزرا ہوا عہد آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، میری نسل کے جن اہل پاکستان نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ان کے بڑے بھائی مولانا ابوالخیر مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، حکیم حبیب اشعر، خواجہ محمد شفیع دہلوی اور حکیم سعید دہلوی جیسی شخصیات میں رچی بسی اس تہذیب کی جھلکیاں دیکھی ہیں۔ ان کے لیے مولانا جلال الدین عمری کی یہ نشست یوں سمجھئے کہ قندِ مکرر کا لطف دے گئی۔“

(نوائے وقت ۱۷ مارچ ۲۰۰۵ء)

ان الفاظ میں حقیقت سے زیادہ محبت اور خلوص کا اظہار ہے۔ اسے ایک مہمان کی تکریم اور ہمت افزائی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وقت کے اکابر کے ساتھ ایک چھوٹے فرد کا نام بھی شامل کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور اس حسن ظن کو پورا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

جب سے علمی دنیا سے تعارف ہوا پنجاب یونیورسٹی کا نام سن رکھا تھا۔ یہ بڑے صغیر کی ان قدیم یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے جنہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ اس کی بڑی خدمات ہیں۔ لاہور ایئر پورٹ سے جب ہم پنجاب یونیورسٹی کے کیمپس کے قریب سے گزرے تو اسے دیکھنے کی خواہش ابھر آئی اور یہ طے ہوا کہ اس کا موقع ضرور نکالا جائے گا۔ اسی اثناء میں یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کی جانب سے اسلامی تحقیق کی ضرورت، اہمیت اور طریق کار کے موضوع پر خطاب کی دعوت دی گئی۔ میں نے بخوشی اسے منظور کر لیا۔ ۱۶ مارچ ۲۰۰۵ء کو صبح دس بجے پروگرام شروع ہوا۔ آڈیو ریم میں شعبہ کے اساتذہ کرام کے علاوہ ایم اے، ایم فل اور پی، ایچ، ڈی کے طلبہ و طالبات کئی سو کی تعداد میں موجود تھے۔ حسب معمول تعارف کے بعد اظہار خیال کے لئے کہا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ اسلامیات پر تحقیقی کام افراد کے ذریعہ بھی اور دینی اداروں، جامعات اور یونیورسٹیوں کے ذریعہ بھی ہوتا رہا ہے اور بعض بڑے قابل قدر کام انجام پائے ہیں۔

یونیورسٹیوں میں ریسرچ کے کام بالعموم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک کی نوعیت تاریخی ہے۔ جیسے افراد کی سوانح، خدمات یا کسی خاص دور کا مطالعہ اور جائزہ۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے ماضی کی صحیح صورت حال سامنے آتی ہے، غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور ان سے سبق بھی سیکھا جاسکتا ہے۔ دوسرا کام مخطوطات کے ایڈٹ کرنے کا ہوتا ہے۔ اس سے قدیم مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے تصحیح کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور استفادہ آسان ہوتا ہے۔ یہ علم کی بڑی خدمت ہے۔ اس میدان میں ماضی قریب میں عرب مصنفین نے قدیم عربی تصنیفات کی جس دقت نظر سے تحقیق کی اور انھیں ایڈٹ کیا ہے اس میں وہ سب سے آگے نظر آتے ہیں۔

دینی علوم کے ماہرین اور دینی اداروں کے موضوعات بالعموم وہ ہوتے ہیں جو خود ان کے درمیان زیر بحث رہتے ہیں۔ جیسے توحید، شرک، بدعت، فہم قرآن، فہم حدیث ان کا تعبیر و تشریح میں اختلاف، فقہی مسائل میں راجح مسلک کی تعیین وغیرہ۔ اس طرح کے مسائل پر ضخیم کتابیں اور رسائل لکھے گئے ہیں اور ہر ایک نے تحقیق کا حق ادا کرنے کی ممکن حد تک کوشش کی ہے۔ لیکن کچھ مسائل وہ بھی ہیں جو عالمی سطح پر زیر بحث ہیں اور ان کی طرف اسلامی محققین کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ آج خدا کا وجود، رسالت کا ثبوت اور آخرت کا امکان ہی زیر بحث ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہی بات ناقابل تصور ہے کہ اسلام جو پندرہ سو سال قبل آیا تھا آج بھی اس کی معنویت باقی ہے اور وہ ناقابل تغیر ہے۔ اسی طرح اسلام کی معاشرت، اس کے قوانین حدود و قصاص، عورت اور مرد کے حقوق اور ان کے دائرہ کار، اسلام کا سیاسی فکر، اسلام کا تصور عدل و مساوات، غیر مسلموں سے تعلقات اور غیر اسلامی ریاست میں مسلمانوں کا کردار جیسے بہت سے موضوعات ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان موضوعات پر کام نہیں ہوا ہے۔ بہت سی قیمتی تحقیقات موجود ہیں لیکن اس کے باوجود یہ مزید تحقیق اور غور و فکر کا تقاضا کرتے ہیں۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد صدر شعبہ کے ساتھ لائبریری دیکھنے کا موقع ملا۔ خاصی بڑی لائبریری ہے اور ریسرچ اسکالرس کی ضروریات بڑی حد تک پوری کر سکتی ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد یونیورسٹی کے ادارہ تعلیم و تحقیق کے اساتذہ کے ساتھ نشست تھی۔ بیس پچیس افراد شریک تھے۔ ان میں علمی موضوعات کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے حالات بھی زیر بحث رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کا نیا کیمپس کافی وسیع رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ درمیان میں نہر ہے اس کی وجہ سے منظر بڑا خوش نما ہے۔ اس کے سرسری معائنہ کے لیے بھی کافی وقت چاہیے تھا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کچھ حصہ دیکھنے کا موقع ملا۔ دیر گئے واپسی ہوئی۔

۱۶ مارچ کو بعد عشاء ۸:۳۰ بجے سید منور حسن صاحب قیم جماعت اسلامی پاکستان نے مرکب جماعت میں 'تقریب ملاقات' کا اہتمام کیا۔ اس میں لاہور میں موجود جماعت کے ذمہ دار اصحاب اور بعض دوسرے احباب شریک ہوئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ

بہ یک وقت ان سب حضرات سے تعارف و ملاقات کا موقع نکل آیا۔ سید منور حسن صاحب کے ابتدائی کلمات کے بعد محترم قاضی حسین احمد صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان نے وحدت امت کے تصور پر اظہارِ خیال فرمایا کہ مسلمان کسی بھی ملک میں ہوں، کوئی بھی زبان بولتے ہوں اور ان کے کتنے ہی رنگ روپ ہوں وہ سب ایک ہیں۔ اسلام نے ان سب کو ایک امت بنایا ہے۔ ان سب کا مقصد حیات ایک ہے اور سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس امت کو اسلام ہی نے ایک رشتہ وحدت میں پرویا ہے۔ اگر اس کے اندر یہ احساس جاگ اٹھے تو اس کا انتشار دور ہو سکتا ہے اور وہ اتحاد و اتفاق کی منزل کی طرف پیش قدمی کر سکتی ہے۔ اس سے عالمی سطح پر اس کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور اس کی سر بلندی کی راہیں کھل سکتی ہیں۔

محترم قاضی صاحب کی تقریر کے بعد مجھے اظہارِ خیال کا حکم ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ اس دور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ مختلف ملکوں میں اسلامی تحریکات کام کر رہی ہیں۔ ان سب کا مقصد اقامتِ دین ہے۔ اقامتِ دین کا تصور بڑا وسیع ہے۔ اس کا تعلق فرد، معاشرے اور زیاست ہر ایک سے ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ فرد کا اپنی ذات پر دین قائم کرنا ہے۔ اس پر ہماری اصل توجہ ہونی چاہیے۔ اس کے بعد ہی سماج اور ریاست پر دین کا قائم کرنا آسان ہوگا۔ اقامتِ دین کا کام دعوتِ دین سے شروع ہوتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں جماعتِ اسلامی ہند کی کوششوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ جماعت نے ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں میں قرآن و حدیث کے تراجم اور اسلامی لٹریچر تیار کیا ہے، اور اسے عام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دلچسپی سے یہ باتیں سنی گئیں۔ پروگرام کے بعد عشائیہ تھا جس میں سبھی حضرات نے شرکت کی۔

ان چار دنوں میں کئی ایک اخبارات نے بہت تفصیل سے انٹرویو لیے۔ ان انٹرویوز میں ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال، اس کا سیکولر کردار، مسلمانوں کی تعلیمی کوششیں، مدارس کا نصاب، موجودہ دور میں اجتہاد کی اہمیت، جماعت اسلامی کی خدمات، مسلم تنظیموں کی حالت، اسلام کی دعوت اور اس کے اثرات اور مسلمانوں کو درپیش دیگر بہت

سے مسائل شامل تھے۔ ہفت روزہ ’تکبیر‘ کراچی کے نمائندے نے تین صفحات پر مشتمل اپنے انٹرویو پر حسب ذیل نوٹ لکھا جس سے سوالات کی نوعیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے؛

”جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر سید جلال الدین عمری، گزشتہ دنوں لاہور تشریف لائے تو خواہش ہوئی کہ ان کے خیالات کی روشنی میں یہ دیکھا جائے کہ ایک مذہبی اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے ان کی نظر میں بھارت کے سیاسی منظر نامے کے خدوخال کیا ہیں۔ ہندو غلبہ رکھنے والے معاشرے میں عام شہری بن کر رہنے اور ایک اسلامی جماعت کے قائد کے طور پر شب و روز گزارنے میں کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے مابین بہتر تعلقات کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، بھارت کے مسلمان اور بالخصوص ہندو اکثریت اس میں کتنی دلچسپی رکھتی ہے۔ عام مسلمانوں کی بھارت میں کیا حالت ہے۔ وہ کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ ملکی سیاست میں ان کا کیا کردار ہے۔ انہیں کوئی فیصلہ کن پوزیشن حاصل ہے یا نہیں۔ سماجی لحاظ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ ان سے کی جانے والی گفتگو میں یہ جاننے کا موقع ملا کہ وہ اپنے ملک بھارت کے معاملات کو کس انداز سے دیکھتے ہیں“ (ہفت روزہ ’تکبیر‘ ۱۷ مارچ ۲۰۰۵ء)۔

اس سے باآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق پاکستانی عوام کے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کیا ہیں اور وہ کس قسم کی معلومات چاہتے ہیں؟ ان سوالات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی حالت زیر بحث نہیں آئی۔ اس سے دل چسپی بھی کم ہی دیکھنے میں آئی۔

روزنامہ ’بھارت‘ کراچی کے ہفت روزہ ایڈیشن ’فرانڈے اسٹیش‘ اور ہفت روزہ ’ایشیا‘ کے انٹرویو پر بھی خاصے طویل اور ان اخبارات کے پانچ چھ صفحات پر پھیلے ہوئے تھے۔ روزنامہ ’پاکستان‘ کا شمار وہاں کے بڑے اخبارات میں ہوتا ہے۔ اس نے پورے ایک صفحہ پر انٹرویو شائع کیا۔ ان اخبارات نے اس عاجز کے خیالات کو جو اہمیت دی اس کے لئے میں شکر گزار ہوں، گوکہ بعض مسائل میں میرے خیالات کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکی۔ بعض دوسرے اخبارات کے انٹرویوز مجھے نہیں مل سکے۔

۷ ارمارچ کولاہور کی سیر کا پروگرام تھا، لیکن اس سے پہلے صبح نو بجے جامعہ مرکز علوم اسلامیہ لاہور میں اساتذہ و طلبا سے خطاب تھا۔ اس سے فارغ ہو کر جناب ملک محمد اشرف اعوان صاحب کے ساتھ لاہور کی سیر کے لئے نکلا۔ حضرت علی بھجوریؒ کے مزار پر حاضری دی۔ حضرت علی بھجوریؒ کا مقبرہ یا مزار شہنشاہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا اس لیے اس میں اس دور کے فنِ تعمیر کی شان نظر آتی ہے۔ بھٹو صاحب نے اپنے دورِ حکومت میں اس کے گیٹ پر سونے کی چادر چڑھائی تھی۔ آج کل یہ محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہے۔ مقبرہ کے چاروں طرف وہی منظر دیکھا جو ہندوستان کی درگاہوں میں نظر آتا ہے۔ مزار پر نذرانے چڑھ رہے تھے، اس کے سامنے سجدے ہو رہے تھے، دعائیں کی جا رہی تھیں اور صاحبِ مزار سے استعانت و استمداد کے عمل میں سیکڑوں مرد و خواتین شریک تھے۔ یہ اس امت کا حال ہے جو توحیدِ خالص کی علم بردار ہے۔ مزار کے احاطے سے باہر نکلے ہی تھے کہ تیز بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا، لیکن ہمارا سفر جاری رہا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی شاہی مسجد، مزارِ اقبال، منارہ پاکستان وغیرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ ۷ ارمارچ کی شب میں یہ عاجز اسلام آباد اس احساس کے ساتھ روانہ ہوا کہ لاہور مزید وقت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہاں کے بہت سے قدیم و جدید ادارے ہیں جنہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ بہت سی دینی، علمی و ادبی شخصیتیں ہیں جن سے ملاقات کرنی تھی جو نہیں ہو سکی۔

دوستوں نے لاہور ایئر پورٹ پر الوداع کہا اور میں اسلام آباد روانہ ہو گیا۔ جہاز کسی قدر تاخیر سے روانہ ہوا اور 9:30 بجے کے قریب اسلام آباد پہنچا۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ ڈاکٹر عصمت اللہ سے میری ملاقات سعودی عرب کی ہے جب کہ وہ مکہ مکرمہ میں زیرِ تعلیم تھے۔ یونیورسٹی کی گاڑی میں ہم لوگ روانہ ہوئے۔ رات کا وقت تھا۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کا فطری حسن بجلی کی روشنی میں اپنے جلوے دکھا رہا تھا۔ ہم لوگ سیدھے ہوٹل چنورائل (Chateau Royal) پہنچے۔ یونیورسٹی کی طرف سے یہیں قیام کا انتظام تھا۔ ہوٹل ہی میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور رات گئے ڈاکٹر عصمت اللہ روانہ ہو گئے۔ صبح ڈاکٹر محمد طاہر منصور ی صدر شعبہ اسلامی قانون

اسلامی یونیورسٹی ہوٹل تشریف لائے۔ وہ سیمینار کے آرگنائزر اور روح رواں تھے۔ اس کے لئے انہوں نے اس عاجز سے مسلسل رابطہ رکھا۔ وہ عربی اور اردو میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ روانہ ہوئے ہی تھے کہ محترم ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری تشریف لے آئے، جو اسلامی یونیورسٹی میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہیں۔ اسی کے تحت سیمینار ہو رہا تھا۔ سیمینار میں شرکت کا باضابطہ دعوت نامہ انہیں کی طرف سے تھا۔ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری علمی دنیا کی معروف شخصیت اور انگریزی کے ادیب ہیں۔ اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر (LEICESTER) لندن سے بھی ان کا تعلق ہے۔ انہوں نے مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن کے تین حصوں کا بعض دوسرے رفقاء کی مدد سے ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ اسے ایڈٹ بھی کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ اب انہوں نے مولانا کے ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے جو اشاعت کے مرحلے میں ہے۔ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بڑی نستعلیق اور مہذب شخصیت ہے۔ بہت دھیمے اور شائستہ انداز میں بولتے ہیں۔ بڑی اپنائیت کے ساتھ خیریت اور حالات معلوم کرتے رہے اور یونیورسٹی آنے کی دعوت دے کر روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد یونیورسٹی کی گاڑی آگئی۔ میں ان کے دفتر پہنچا، وہاں شعبہ کے بعض اساتذہ سے تعارف حاصل ہوا۔

۱۸ مارچ جمعہ کا دن تھا۔ ڈاکٹر محمد طاہر منصورؒ کے ساتھ فیصل مسجد میں نماز پڑھی۔ فیصل مسجد بڑی کشادہ اور بہت خوب صورت ہے۔ نئی مسجدوں میں شاید ہندو پاک میں کوئی مسجد اتنی خوب صورت اور وسیع نہ ہوگی۔ مسجد اور اس کے حسن انتظام کو دیکھ کر انبساط اور سرور کی کیفیت محسوس ہوئی۔ بتایا گیا کہ اس حسین مسجد میں دو لاکھ افراد بہ یک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد میں خواتین کے لئے بھی نماز کا انتظام ہے اور خواتین شریک ہوتی بھی ہیں۔ جمعہ میں خواتین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اس لئے پوری مسجد دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ ہم لوگ مسجد پہنچے تو جامعہ کی مشہور شخصیت ڈاکٹر خالد مسعود صاحب تفریر کر رہے تھے۔ عالم اسلام کے معروف عالم اور فقیہ وہبہ زہیبی نے، جن کی کتاب الفقہ الاسلامی وادلتہ اسلامی فقہ پر ایک دائرۃ المعارف ہے، جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ نماز

کے بعد ڈاکٹر محمد طاہر منصور کی ساتھ اپنے مستقر ہوٹل پہنچا اور شام تک دوستوں سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۹ مارچ کو صبح 10:30 بجے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے خوب صورت آڈیٹوریم میں سیمینار شروع ہوا۔ سیمینار کا موضوع تھا 'اجتماعی اجتہاد: تصور، ارتقاء، اور عملی صورتیں'۔ اجتہاد کی اہمیت و ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ شریعت کے دائمی اور ابدی ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہر دور میں انفرادی اجتہاد ہوتا رہا ہے یا سابقہ اجتہادات کی روشنی میں فتوے دیے گئے یا فیصلے ہوئے ہیں لیکن موجودہ دور میں حالات اتنے بدل گئے ہیں اور مسائل اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ کسی ایک فرد کے لئے شریعت کی روشنی میں ہر معاملہ میں رہنمائی کرنا دشوار ہے، اس لئے یہ رجحان ابھر رہا ہے کہ اجتہاد اجتماعی ہو۔ پیش نظر مسائل سے واقف کار افراد اور دین و شریعت کے ماہرین مل بیٹھیں اور آپس کے تبادلہ خیال کے بعد اسلام کا موقف واضح کریں۔ اس مسئلے میں اللہ کا شکر ہے کہ مختلف ممالک میں علمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان میں ہندوستان کی اسلامک فقہ اکیڈمی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ لیکن ابھی یہ طریقہ کار عام نہیں ہے۔ اس پس منظر میں سیمینار کا موضوع اہم تھا۔ اسے اجتہاد کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کہا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد طاہر منصور نے سیمینار کا بہت خوب صورت الفاظ میں تعارف پیش کیا۔ خیر مقدمی کلمات ڈاکٹر اسحاق انصاری کے تھے۔ ان کے انداز گفتگو کی طرح ان کی تحریر سے بھی تہذیب و شائستگی اور متانت کا اظہار ہوتا ہے۔

کلیدی خطبہ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کا تھا۔ محترم ڈاکٹر محمود غازی صاحب سے لیسٹر میں کئی سال قبل ایک ہفتے سے زیادہ کی رفاقت رہی ہے۔ سعودی عرب میں بھی ان سے تھوڑی دیر کے لئے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایک معتبر علمی شخصیت ہیں۔ دینی علوم اور جدید افکار و نظریات سے براہ راست واقف ہیں۔ میری دو کتابوں (مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ اور اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور) کے انگریزی تراجم پر ان کے تفصیلی تبصرے اسلامک بک ریویولوشن میں شائع ہو چکے ہیں۔ سیمینار کے دوران میں

ان سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کا موقع ملا۔

ڈاکٹر وہبہ زہلی سیمینار کے مہمانِ خصوصی تھے۔ ان کی شرکت اور خطاب نے سیمینار کے وقار میں اضافہ کیا۔ فقہ کے میدان میں اس وقت انہیں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ آخر میں جناب وسیم سجاد صاحب سابق چیرمین سنیت نے صدارتی خطبہ پیش فرمایا۔ کلماتِ تشکر جناب خلیل الرحمن صاحب ریکٹر جامعہ اسلامیہ نے ادا کیے۔ وہ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ تین سال قبل حج میں تقریباً ایک ہفتہ ان کا ساتھ رہا۔ ان کی وضع قطع علماء کی سی ہے اور سیرت و اخلاق میں جاذبیت پائی جاتی ہے۔ انہیں حج کے ایام کی رفاقت یاد تھی۔ بڑی محبت سے ملے۔

سیمینار میں ہندوستان سے اس خاکسار کے علاوہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سکرٹری اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی، مولانا محمد سعود عالم قاسمی، ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مولانا فہیم اختر ندوی نے شرکت کی۔

سیمینار کی مختلف نشستیں رہیں۔ پہلی نشست اس عاجز کی صدارت میں ہوئی۔ موضوع تھا 'اجتماعی اجتہاد: تصور، ارتقاء، شرعی حیثیت اور اصول و ضوابط' اس پر کئی پہلوؤں سے گفتگو ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ اجتماعی اجتہاد دراصل باہم مشورے سے کسی نتیجے تک پہنچنے کا نام ہے۔ ہمارے فقہاء نے قضا کے جو آداب بیان کئے ہیں ان میں اہل علم سے مشورہ بھی شامل ہے۔ اسے اجماع تو نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ اجماع کی طرف ایک طرح کی پیش قدمی ہے۔ اجتماعی غور و فکر کی اسلامی تاریخ میں دورِ اول سے روایت رہی ہے اور مسائل پر مل جل کر غور و فکر ہوتا رہا ہے۔ البتہ فقہ اسلامی کے مطالعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون سا اجتہاد انفرادی ہے اور کون سا اجتماعی ہے۔ اسی طرح اس کے اصول و ضوابط بھی متعین نہیں ہیں ان کی تعیین کی کوشش ہونی چاہیے۔

سیمینار کا آخری اجلاس برادر دم خالد سیف اللہ رحمانی کی صدارت میں ہوا جس کا موضوع تھا 'اجتماعی اجتہاد اور اہم عصری مسائل'۔ اس طرح سیمینار کے آغاز اور اختتام کا اعزاز دو ہندوستانیوں کو حاصل ہوا۔

سیمینار کی خاص بات یہ تھی کہ پہلے اور دوسرے روز بعد مغرب تو سیمعی خطابات تھے۔ پہلے روز اس عاجز کا اور مولانا جاوید احمد غامدی صاحب کا خطاب تھا۔ جاوید احمد غامدی صاحب اپنے بعض نئے خیالات کی وجہ سے وہاں زیر بحث رہتے ہیں۔ بجلی کی خرابی کی وجہ سے میں آڈیو ریم میں دیر سے پہنچا۔ ان کی تقریر سے استفادہ نہ کر سکا۔ میں نے اپنے خطاب میں کہا کہ عبادات اور معاشرت کے احکام شریعت میں تفصیل سے بیان کر دیے گئے ہیں جن میں اجتہاد کی ضرورت کم ہی پیش آتی ہے۔ اس سلسلے میں جو طویل بحثیں ہمارے ہاں موجود ہیں ان کا تعلق زیادہ تر اس امر سے ہے کہ احکام کی نوعیت کیا ہے اور یہ کس شکل میں انجام دیئے جائیں گے اور ان پر صحابہ کرام کا کس طرح عمل ہوتا رہا ہے۔ اجتہاد کی ضرورت عام طور پر معاملات اور سیاسی امور و مسائل میں پیش آتی ہے۔ ان میں شریعت نے زیادہ تر اصولی ہدایات دی ہیں۔ موجودہ حالات پر ان کا انطباق اور ان کی روشنی میں اسلامی احکام کو معلوم کرنا ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ ضرورت اجتہاد ہی کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہے اور اس میں اجتماعی کوشش بھی ہونی چاہیے۔ سیمینار کی صدارت محترم مولانا محمود احمد غازی صاحب، صدر اسلامی یونیورسٹی فرما رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جن دو اصحاب نے اس وقت خطاب کیا بعض مسائل میں ان کا انداز فکر مختلف ہو سکتا ہے لیکن ہمیں خوشی ہے کہ اجتہاد کی ضرورت، اس کے دائرہ کار اور اجتماعی اجتہاد کی ضرورت پر ان کا اتفاق ہے۔

سیمینار کے دوسرے روز بھی ڈاکٹر محمد خالد علوی کی صدارت میں تو سیمعی خطابات کا پروگرام تھا۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مولانا ابوعمار زاہد راشدی صاحب نے خطاب کیا۔ مولانا زاہد راشدی کا زور اس بات پر تھا کہ پاکستان میں اجتماعی اجتہاد کا عمل جاری ہے۔ انہوں نے سیاسی طور پر جو مشترکہ کوششیں ہوئیں انہیں اجتماعی اجتہاد قرار دیا۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے شجیرہ انداز میں اس سے اختلاف کیا اور اس کی نوعیت واضح کی۔ آخر میں ڈاکٹر خالد علوی صاحب کے خطاب سے اس کی مزید وضاحت ہوئی۔

۲۱ مارچ کو سیمینار ہی سے متعلق پاکستانی ٹیلی ویژن سے ڈاکٹر خالد مسعود علوی، مولانا عبدالرحمن مدنی اور اس عاجز کا پروگرام نشر ہوا۔ سوالات اجتماعی اجتہاد اور پارلیمنٹ کے

حق اجتہاد اور عورت کی امامت وغیرہ سے متعلق تھے۔ میں نے عورت کی امامت کے ذیل میں عرض کیا کہ اس پر امامت کا اتفاق ہے کہ عورت نماز میں مردوں کی امامت نہیں کر سکتی۔ دورِ اول سے آج تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ عورت عورتوں کی جماعت کی امامت کر سکتی ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں یہ جائز ہے اور سلف سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

اسی روز جناب ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کی صدارت میں میں نے اپنا مضمون 'دارالاسلام اور دارالکتب کا تصور جدید عالم گیریت کے سیاق میں' پیش کیا۔ میں نے عرض کیا کہ فقہاء نے یہ تقسیم اپنے دور کے پس منظر میں کی ہے۔ اس کی بنیاد پر پورے اسلام کے تصور سیاست پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ درست نہیں ہیں، البتہ یہ تقسیم جن مخصوص حالت میں کی گئی تھی وہ تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

مجھے دل چسپی صحت کے موضوع سے رہی ہے۔ چنانچہ صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات کے عنوان سے میری ایک ضخیم کتاب ۱۹۹۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا ملیا زبان میں ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب نے کویت کے ادارے 'المظنمۃ العالمیۃ للعلوم الطبیۃ' پر اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس ادارہ نے اس موضوع پر خاصا کام کیا ہے اور متعدد سیمینار کر چکا ہے اور اس کی تحقیقات بھی سامنے آچکی ہیں۔ افسوس کہ اس ادارہ سے میرا کوئی ربط نہیں رہا اور نہ اس کی معلومات سے استفادہ کیا جاسکتا تھا اور میری کتاب بھی شاید ادارہ کے لیے قابل توجہ ہوتی اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتا۔

سیمینار کا ابتدائی خاکہ بہت خوب صورت اور جامع تھا جس میں بہت سے نئے موضوعات کی نشان دہی کی گئی تھی لیکن چند ایک موضوعات ہی زیر بحث آسکے۔ سیمینار میں گو کہ مختلف حلقوں کی نمائندگی تھی لیکن یہ اس سے زیادہ نمائندہ ہو سکتا تھا۔ خود پاکستان کے بعض بڑے اداروں اور اہم شخصیات کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ سیمیناروں میں مقالات پڑھے تو جاتے ہیں لیکن بالعموم نتیجہ خیز گفتگو نہیں ہوتی یہ صورت حال یہاں بھی رہی۔ سیمینار کے آخر میں بعض قراردادیں منظور کی گئیں۔

تقسیم ملک کے بعد پاکستان کی راجدھانی کراچی تھی۔ صدر ایوب خاں کے دور میں راجدھانی اسلام آباد منتقل ہو گئی۔ اسلام آباد کا محل وقوع بڑا حسین اور خوب صورت ہے۔ سرسبز و شاداب اور رنگین پہاڑیوں کے درمیان واقع یہ شہر اپنے اندر بڑی دل کشی رکھتا ہے، مزید یہ کہ اسے ایک منصوبے کے تحت اس طرح بسایا جا رہا ہے کہ اس کا فطری حسن متاثر نہ ہو۔ ایک سیکڑ اور دوسرے سیکڑ کے درمیان خاصی طویل سبز پٹی (Green Belt) ہے۔ اس کے اطراف و اکناف کے علاقے بھی اپنی خوب صورتی کے لئے مشہور ہیں۔ خاص طور پر 'میرٹری' کا ذکر آتا رہا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان مقامات کو گھوم پھر کر دیکھا جائے، لیکن سمینار کے دوران میں مسلسل بارش کی وجہ سے اس گل گشت کا موقع نہیں ملا۔ ۲۲ مارچ کو یونیورسٹی کی طرف سے سیر و تفریح کا پروگرام بن سکتا تھا لیکن میں نے بعض پیشگی مصروفیات کی وجہ سے معذرت کر لی۔ البتہ ۲۲ کی صبح خلیل الرحمن چشتی صاحب کے صاحب زادے ۹ بجے مجھے ہوٹل سے لے گئے اور اسلام آباد کے بعض خاص مقامات کی سیر کرائی اور حسب پروگرام ایک بیجے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز (INSTITUTE OF POLICY STUDIES) یا (I.P.S.) پہنچا دیا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک اہم تحقیقی ادارہ ہے اس کا مقصد تعلیم، سیاست، معیشت، صنعت اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں عالمی سطح پر جو پالیسیاں وضع کی جاتی ہیں اور جو براہ راست یا بالواسطہ امت مسلمہ پر اثر انداز ہو سکتی ہیں، ان کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے اور آج کے حالات میں اسلام ان کا جو متبادل حل پیش کرتا ہے اسے پیش کیا جائے۔ اس کے پس منظر میں خاص طور پر پاکستان ہوتا ہے I.P.S. اب تک ان موضوعات پر 163 کتابیں شائع کر چکا ہے۔ سات جرائد و رسائل یہاں سے نکل رہے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ایک ہزار سے زیادہ رپورٹیں اس کے پاس موجود ہیں۔ اس ادارے سے پاکستان اور بیرون پاکستان کی بعض ممتاز شخصیتیں وابستہ ہیں۔ اس کی قیادت و سربراہی محترم پروفیسر خورشید احمد کر رہے ہیں۔ پروفیسر خورشید احمد عالمی شہرت کے حامل ماہر معاشیات ہیں۔ وہ حکومت پاکستان میں وزیر اور پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین رہ چکے ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف معاملات و مسائل میں اپنے خطابات اور لکچرس کے ذریعہ اسلام کی

ترجمانی کے فرائض آج بھی انجام دیتے رہتے ہیں۔ ان کی اسلامی خدمات پر انہیں ۱۹۹۰ء میں فیصل ایوارڈ مل چکا ہے۔ ایوارڈ کے بعد سعودی عرب میں ان کے دوست احباب نے مبارک بادی کی تقریب رکھی تھی۔ اتفاق سے اس وقت میں سعودی عرب میں تھا۔ میں نے بھی اس تقریب میں شرکت کی۔ یہ ان سے میری پہلی لیکن رسمی ملاقات تھی۔ جو تریک و تہنیت سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے بعد لیسٹر میں ان سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں اور علمی و فکری مسائل پر تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ وہ ان اصحاب میں سے ہیں جو اس بے علم کی خدمات کی قدر کرتے ہیں اور برملا اس کے اظہار میں جنہیں تامل نہیں ہوتا۔ ان سے ایک طرح کی قربت اور انس محسوس ہوتا ہے۔ وہ بار بار کہتے ہیں کہ تمہاری تحریروں کا انگریزی میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ ان کی خواہش میری بھی خواہش ہے لیکن اب تک صرف بعض کتابوں ہی کا ترجمہ ہو سکا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مزید تراجم کی کیا صورت ہوگی؟

I.P.S. کے ایک ریٹائرڈ ایگزیکٹو خالد رحمان صاحب ہیں۔ ان کا پس منظر بھی

معاشیات کا ہے۔ ادارہ کے عملاً وہی نگران ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ انہیں بھی میرے موضوعات سے دلچسپی ہے اور بڑے پیمانے پر میری تحریروں کی اشاعت چاہتے ہیں۔

اسلام آباد پینشنے کے دوسرے ہی روز خالد رحمان صاحب قیام گاہ پر تشریف لائے

اور ۲۲ مارچ کو تین بجے I.P.S. میں میرا پروگرام طے ہو گیا۔ موضوع تھا عورت اور معیشت۔ مجھے اسلام کے نقطہ نظر کی وضاحت کرنی تھی۔ منتخب مجمع تھا۔ سو سے زیادہ ہی افراد شریک رہے ہوں گے۔ اس میں خواتین کی تعداد بھی کم و بیش ایک تہائی ضرور تھی۔ اجلاس کے آغاز میں پروفیسر خورشید احمد صاحب نے اس عاجز کے تعارف میں کہا کہ انہوں نے بعض بالکل نئے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور بعض موضوعات جن پر ہمارے ہاں صرف اشارات ملتے ہیں ان کی تفصیل فراہم کی اور انہیں مدلل کیا ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ پھر بعض نامور شخصیات کے ذیل میں اس عاجز کا نام لیا تو میری آنکھوں سے ندامت کے آنسو رواں ہو گئے اور دل اللہ تعالیٰ کے اس احسان سے لبریز ہو گیا کہ اس نے ایک طالب علم کی معمولی خدمات کو یہ وقار اور اعتبار بخشا کہ اہل علم انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔

میں نے اپنے خطاب میں عرض کیا کہ اسلام نے معاشی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔ بیوی بچوں کا نان نفقہ اس پر لازم ہے۔ ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کی کفالت کا بوجھ بھی بسا اوقات اسے اٹھانا پڑتا ہے اس لئے وہ معاشی جدوجہد پر مجبور ہے۔

عورت پر معاشی ذمہ داریاں نہیں ہیں، اس لئے وہ شرعاً اس کے لئے نہ مجبور ہے اور نہ مجبور کی جاسکتی ہے لیکن معاشی جدوجہد کا حق وہ ضرور رکھتی ہے۔ البتہ اسے دو باتیں پیش نظر رکھنی ہوں گی۔ ایک یہ کہ اس کی خانگی ذمہ داریاں مقدم ہیں، انھیں وہ نظر انداز نہیں کر سکتی، لیکن یہاں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جوانی میں عورت کی خانگی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ کم ہوتی چلی جاتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ بہت سی ذمہ داریوں سے عملاً سبک دوش ہو جاتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ گھر سے باہر معاشی جدوجہد کے لئے اسے شوہر سے اجازت لینی ہوگی، اس لئے کہ گھر اور خاندان کے نظام کو برقرار رکھنے ہی کے لئے شوہر اس کا نان و نفقہ برداشت کرتا ہے۔ ان امور کی پابندی کرتے ہوئے وہ اخلاقی حدود میں ملازمت، تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کسی بھی میدان میں کام کر سکتی ہے۔ شریعت کی رو سے وہ اپنے مال و جائیداد اور آمدنی کی خود مالک ہے۔ جو کچھ حاصل کرے گی اس کا اپنا ہوگا اور وہ اپنی مرضی سے اس میں تصرف کر سکتی ہے۔ شریعت کے نقطہ نظر سے وہ صاحب نصاب ہوتی ہے۔ اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ وہ اپنے قریبی عزیزوں کی وارث ہوتی ہے اور اس کی وارث دوسروں کو منتقل ہوتی ہے۔

تقریر ختم ہونے کے بعد سوالات کا وقفہ تھا۔ سوالات مختلف نوعیت کے تھے۔ ان کا تعلق پاکستان اور عالمی صورت حال دونوں سے تھا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ I.P.S. کی رہنمائی میں خواتین کا ایک گروپ ان مسائل کا گہرائی سے مطالعہ کر رہا ہے اور حکومت پاکستان جو اقدامات کر رہی ہے اور معاشرے پر اس کے جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں ان کا بھی اسے شدید احساس ہے۔ آخر میں ڈاکٹر خالد علوی صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں مغربی اقدار اور اسلامی اقدار کے مابین فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ ہم اس کی ہر بات کی

تقلید نہیں کر سکتے۔ ہمیں اسلامی تعلیمات کے پس منظر میں غور کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر انیس احمد صاحب کا نام عرصہ سے سن رکھا تھا۔ غالباً کسی وقت ان سے ہندوستان میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان سے ملاقات کو جی چاہ رہا تھا۔ وہ خود بھی ملاقات کے خواہش مند تھے۔ وہ ایک معروف اسکالر ہیں۔ اسلامی یونیورسٹی ملیشیا میں صدر شعبہ اسلامیات، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں دعوہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر رہے ہیں۔ ایک پرائیوٹ یونیورسٹی Riphah International University کے وائس چانسلر ہیں۔ I.P.S. سے ان کا قریبی تعلق ہے۔ یہاں سے ان کی ادارت میں مغرب اور اسلام کے نام سے ایک سہ ماہی مجلہ نکلتا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا اردو میں غالباً واحد مجلہ ہے۔ اس کے ہر شمارے میں کسی نہ کسی موضوع پر مغرب کے اہل فکر کے مضامین کا ترجمہ یا خلاصہ پیش کر دیا جاتا ہے۔ ادارہ میں یا الگ سے کسی مضمون میں ان کا نوٹس لیا جاتا ہے۔ وہ سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے I.P.S. میں ملاقات رہی اور تشنگی کا احساس چھوڑ گئی۔

۲۲ رہی کو I.P.S. سے فارغ ہونے کے بعد الفوز اکیڈمی پہنچا۔ یہ اکیڈمی تعلیم یافتہ اشخاص میں اسلام کا فہم عام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے لئے قرآن و حدیث کے دروس کا سلسلہ جاری ہے۔ دینی موضوعات پر مفید کتابیں اور رسائل بھی اس نے شائع کئے ہیں۔ عربی کی تعلیم کا ذوق پیدا کیا جا رہا ہے اور اس کے لیے بعض کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ اس کے صدر جناب محمد خاں منہاس صاحب ہیں جو ملک اور بیرون ملک میں اعلیٰ مناصب پر کام کر چکے ہیں اور اس وقت بھی بعض اداروں کو ان کی خدمات حاصل ہیں۔ اس کے سکریٹری مولانا غلیل الرحمن چشتی صاحب ہیں۔ ان کی پیدائش ہندوستان کے شہر حیدرآباد کی ہے لیکن انہوں نے ایک عرصہ آسٹریلیا میں گزارا ہے۔ وہاں کی شہریت بھی انہیں حاصل تھی۔ وہ سعودی عرب اور کویت میں بھی رہے ہیں اور اب انہوں نے اسلام آباد کو وطن بنا لیا ہے۔ ان حضرات سے ۲۲ کی شام کو الفوز اکیڈمی میں میرا پروگرام طے تھا۔ اکیڈمی کی مسجد کی چلی منزل میں پروگرام تھا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ خواتین کے لئے الگ انظم تھا۔ میں نے تفصیل سے موجودہ عالمی صورت حال اور عالم اسلام پر ہونے والی فکری یورش کا ذکر کیا اور یہ بتانے کی

کوشش کی کہ ان حالات میں ہمارے کرنے کا کیا کام ہے۔ بڑے صبر و سکون سے حاضرین نے باتیں سنیں۔ بعد میں سوالات بھی ہوئے جن کے جوابات دیئے گئے۔

۲۳ کی صبح ۷ بجے اسلام آباد سے کراچی روانگی تھی۔ ۲۳ کو پاکستان کا قومی دن منایا جاتا ہے، اس وجہ سے جہازوں کی آمد و رفت متاثر تھی چنانچہ ساڑھے دس بجے کا اعلان ہوا۔ مولانا غلیل الرحمن چشتی نے رخصت کیا۔ لیکن عملاً جہاز نے ۱۲ بجے پرواز کی اور 1.45 پر کراچی ایئر پورٹ پر لینڈ کیا۔ میں جہاز سے نکل کر چند ہی قدم چلا تھا کہ ایک نوجوان میرے نام کی تختی لئے کھڑے تھے۔ جن کا تعلق ایئر پورٹ کے عملے سے تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے ملاقات کی اور چند ہی منٹ میں ان کے ساتھ باہر نکل آیا، استقبال کے لیے بالکل نئے احباب جمع تھے۔ میرے اور ان کے درمیان سوائے دین کے رشتہ کے اور کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں زندگی میں دین کا صرف نام لیتا رہا ہوں۔ اس کی برکت ہے کہ بہت سے وہ افراد بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں جن سے میں ناواقف ہوں۔ اگر کوئی شخص دین کی خدمت خلوص کے ساتھ کرے تو دلوں پر اس کی حکم رانی قائم ہو جائے۔ کراچی میں میرا قیام 'قصرِ ناز' میں تھا۔ یہ سرکاری مہمان خانہ ہے۔ یہاں بالعموم پاکستانی اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبران اور اسی طرح کے اصحاب ٹھہرتے ہیں۔ یہ بڑی وسیع اور کشادہ عمارت ہے۔ چاروں طرف کمرے اور درمیان میں خوب صورت صحن ہے۔ کمرے بہت صاف ستھرے ہیں۔ احاطے میں چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ پانچوں وقت نماز ہوتی ہے۔

کراچی میں بڑا ہی مصروف وقت گزرا۔ ہر روز کئی ایک پروگرام ہوئے۔ ۲۴ مارچ کو جامعہ حنیفیہ جانا ہوا۔ یہ جماعت اسلامی پاکستان کا قائم کردہ دینی ادارہ ہے یہاں درسِ نظامی کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کے ذریعہ مستند علماء دین پیدا ہوں گے۔ یہاں علماء کی تنظیم 'جمعیت اتحاد علماء' کے نام سے کام کر رہی ہے اور جمعیت طلبہ عربیہ بھی موجود ہے۔ جامعہ حنیفیہ میں ان سب کا مشہور کہ پروگرام تھا۔ میں نے دینی تعلیم کی اہمیت اور علماء دین کی ذمہ داریاں واضح کیں اور بتایا کہ امت کے اتحاد و اتفاق کے لئے علماء کا اتحاد و اتفاق ضروری ہے۔ اس کے لئے اختلافی مسائل میں

وسعت ذہن ہونی چاہیے۔ فقہی مسائل میں ہر مجتہد کے پاس دلائل ہیں اس لئے کسی کو برسرِ باطل نہیں کہا جاسکتا۔ اختلافی مسائل پر ہمارے اسلاف نے جو کتابیں لکھی ہیں ان سے اس کی اچھی طرح وضاحت ہوتی ہے۔ یہ نشست ایک گھنٹے سے زیادہ جاری رہی اور مجلس میں موجود علماء نے بتایا کہ اسی سچ پران کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

اسی روز ادارہٴ نورِ حق میں بعدِ مغربِ جماعتِ اسلامی کراچی کا اجتماع تھا۔ ایک ہزار سے زیادہ کارکن جمع تھے۔ کراچی کے امیرِ جماعت ڈاکٹر معراج الہدیٰ صاحب نے سچے تلے انداز میں بہت مفصل تقریر کی۔ حزبِ اختلاف کے ممتاز قائد قاضی حسین احمد صاحب امیرِ جماعتِ اسلامی پاکستان نے بھی خطاب فرمایا اور ملک کی سیاسی، معاشی اور تعلیمی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس وقت جماعتِ اسلامی پاکستان متحدہ مجلسِ عمل کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے اور بڑے بڑے شہروں میں اس کے کامیاب مہلین مارچ نے اس میں شک نہیں ثابت کر دیا ہے کہ وہ ملک کی ایک بڑی سیاسی طاقت ہے۔ میری تقریر دینی و اخلاقی نوعیت کی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ جماعتِ اسلامی اقامتِ دین کے نصب العین کو لے کر اٹھی ہے۔ اقامتِ دین کا عمل ہر فرد کی ذات سے شروع ہونا چاہیے۔ اسی سے معاشرے میں دین کی اقامت اور حکومت و ریاست میں دین کی حکمرانی ہوگی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست اور معاشرے میں اللہ کے دین کی حکمرانی ان ہی افراد کے ذریعہ قائم ہوگی جو اپنے اوپر دین قائم کر لیں۔ مجمع نے یہ باتیں توجہ سے سنیں۔

اسی دوران میں نوائے وقت کے ہفت روزہ فیملی میگزین کی معاون مدیر صوفیہ یزدانی نے اپنے ہفت روزہ کے لئے تفصیلی انٹرویو لیا۔ جس میں ملکی اور عالمی مسائل کے ساتھ خواتین سے متعلق مسائل بھی تھے۔ اسی طرح ہفت روزہ وجود کو بھی انٹرویو دیا۔ جس میں خاص طور پر تحریر کی موضوعات زیر بحث آئے۔

۲۶ مارچ کے پروگرام میں کراچی یونیورسٹی کو دیکھنا شامل تھا۔ بعض دوستوں کے ساتھ عربی اور اسلامیات کے شعبہ میں جانا ہوا۔ ڈاکٹر نظام الدین منصور چیئرمین شعبہٴ علومِ اسلامی اور ڈاکٹر محمد اسحاق صدر شعبہٴ عربی اور دیگر اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ سبھی

احباب اس عاجز سے کسی نہ کسی درجہ میں واقف نکلے۔ اس لئے اجنبیت کا احساس بالکل نہیں ہوا۔ بڑی محبت اور یکاگت سے بات ہوئی۔ ڈپارٹمنٹ کی لائبریری دیکھی۔ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری ڈاکٹر محمود حسین لائبریری بھی سرسری طور پر دیکھنے کا موقع ملا۔ ہر موضوع سے متعلق نئی نئی کتابیں اور قدیم کتابوں کے نئے ایڈیشن اس قدر تیزی سے سامنے آرہے ہیں کہ آدمی کی پوری زندگی بھی ان کے مطالعہ کے لئے ناکافی ہے۔ وہ کسی بھی موضوع کی صرف منتخب کتابوں ہی کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اسلامک انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ کنٹیمپری اسٹڈیز (I.I.C.S.) کی دعوت پر وہاں حاضری دی۔ یہ ایک نیا ادارہ ہے۔ اس کا مقصد مدارس عربیہ کے فارغین کو مختلف موضوعات پر مزید مطالعہ و تحقیق کا موقع فراہم کرنا اور انہیں اس پہلو سے تیار کرنا ہے کہ وہ آج کے حالات میں اسلام کی رہنمائی کا فرض انجام دے۔ یہاں کے طلبہ اور اساتذہ کے درمیان 'عصر حاضر میں اجتہاد' کے موضوع پر خطاب رہا۔ بعد میں سوالات بھی ہوئے ان کا جواب دیا گیا۔

جناب شمیم احمد صاحب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ پر ایک دستاویزی فلم تیار کر رہے ہیں۔ ان سے انٹرویو طے تھا۔ وہ میری قیام گاہ 'قصر ناز' میں اپنی ٹیم کے ساتھ بعد مغرب پہنچ گئے۔ مولانا مودودیؒ کے علمی مقام و مرتبہ، ان کی خدمات، موجودہ دور میں ان کے اذکار و خیالات کی معنویت اور مولانا سے میرا ذہنی و فکری تعلق جیسے بہت سے سوالات زیر بحث آئے۔ مولانا مودودیؒ اس دور کے عظیم مفکر تھے۔ بعض نامور خادمان دین کے ساتھ ان کا نام آسانی سے لیا جاسکتا ہے، لیکن کسی بھی بڑی سے بڑی شخصیت سے بعض امور میں اختلاف کی گنجائش بہر حال رہتی ہے۔ مولانا مودودیؒ کی بھی ہر بات حرفِ آخر نہیں ہے۔

کراچی کا، بلکہ شاید پاکستان کا سب سے بڑا دینی ادارہ 'دارالعلوم کراچی' ہے جسے حضرت مولانا محمد شفیع عثمانی مفتی اعظم پاکستان نے قائم کیا۔ مجھ جیسے دینیات کے طالب علم کے لئے وہاں حاضری دینا لازم تھا۔ اس کے بغیر کراچی کا سفر ادھورا ہوتا۔ ایک دوست نے حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی سے فون پر رابطہ کیا۔ مولانا ایک ہی روز قبل سری لنکا کے سفر سے

واپس ہوئے تھے اور کسی قدر طبیعت بھی ناساز تھی، لیکن اس کے باوجود مولانا نے وقت دیا۔ صبح دس بجے ملاقات ہوئی۔ مولانا اپنی دینی خدمات کی وجہ سے پاکستان ہی نہیں، پورے عالم اسلام میں معروف ہیں۔ قرآن وحدیث اور فقہ پر وسیع نظر رکھتے ہیں اور موجودہ دور کے پرہیزگارانہ حالات میں رہنمائی کا حق انہیں حاصل ہے۔ مولانا کو میں نے فقہ اکیڈمی حیدرآباد کے اجلاس میں دیکھا تھا۔ لیکن تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ کسی زمانے میں اس عاجز کی کتاب 'مورث اسلامی معاشرے میں' مولانا کی نظر سے گزر چکی تھی، اس لئے وہ نام سے واقف تھے۔ مولانا سے دیر تک بات چیت رہی۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نے دو اساتذہ کرام کو ساتھ کر دیا کہ وہ دارالعلوم اور لائبریری وغیرہ دکھائیں۔ دارالعلوم بہت بڑے رقبے غالباً ساٹھ ستر ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر چیز بالکل جدید طرز کی نظر آئی۔ حدیث کی کلاس دیکھی۔ کلاس روم کسی جدید کالج اور یونیورسٹی کا سا تھا۔ ہال میں کرسیاں نیچے سے اوپر کی طرف لگی ہوئی تھیں اور استاذ اسٹیج سے درس دے رہے تھے۔ اس سے طلبہ استاذ کے سامنے ہوتے ہیں اور وہ بھی استاذ کو براہ راست دیکھتے ہیں۔ اس طرح ان کی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ ہمارے بڑے مدارس بھی یہ انداز اختیار کر سکتے ہیں۔ دارالعلوم کی لائبریری کو اسلامیات کی بہت بڑی لائبریری کہا جاسکتا ہے۔ ہر چیز سلیقے کے ساتھ اور جدید انداز میں مرتب دیکھی۔

اس کا افسوس ہے کہ مولانا تقی عثمانی صاحب کے برادر بزرگ اور صدر دارالعلوم کراچی مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی ایک علمی اور تحقیقی ادارہ ہے۔ اس کی اپنی لائبریری ہے۔ اس کا اپنا مکتبہ اور مطبوعات بھی ہیں۔ اکیڈمی سے معارف، فچر سروس کے نام سے ایک پندرہ روزہ بلوٹین شائع ہوتا ہے جس میں اسلام اور امت مسلمہ سے متعلق موجودہ رجحانات کو بغیر نقد و تبصرہ کے پیش کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی معروف علمی و سیاسی شخصیت پروفیسر عبدالغفور صاحب اس کے صدر ہیں۔ اکیڈمی میں ان سے ملاقات رہی۔ دو پہر کا کھانا انہیں کے ساتھ تھا۔ اکیڈمی کے رفقاء بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر سہید شاہد ہاشمی اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور روح رواں ہیں۔ اکیڈمی میں مغرب کے بعد بھارت میں مسلمانوں کے مسائل اور مستقبل کے عنوان پر خطاب

تھا، چھوٹا سا ہال بھرا ہوا تھا۔ میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی تعلیمی سرگرمیوں کی تفصیل پیش کی اور بتایا کہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلمان نازک حالات سے گزر رہے ہیں، لیکن وہ اپنے دین و ایمان پر ثابت قدم رہے، اپنے تشخص کو باقی رکھا، اپنے اداروں کی حفاظت کی اور ان کو غیر معمولی وسعت دی، نئے دینی ادارے قائم کئے، اسکول، کالج، انجینئرنگ، میڈیکل اور ٹیکنیکل ادارے کھولے۔ سیاسی پہلو سے بھی وہ ایک طاقت ہیں جسے ہندوستان کی کوئی سیاسی پارٹی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی اجتماعی طاقت سے وہاں کی سیاست پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ مسلمان ہندوستان میں پندرہ کروڑ ہیں لیکن مختلف ریاستوں میں وہ دو فی صد سے لے کر ۲۳٪ مرئی صد تک بکھرے ہوئے ہیں (ریاست جموں و کشمیر اس سے مستثنیٰ ہے وہاں وہ اکثریت میں ہیں) اس وجہ سے کہیں بھی وہ محض اپنے بل پر حکومت سازی کے موقف میں نہیں ہیں۔ انہیں غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑتا ہے۔ آخر میں صدرِ مجلس پروفیسر عبدالغفور صاحب نے اظہارِ خیال کیا اور اس پر زور دیا کہ پاک و ہند کے درمیان جو زراعی مسائل ہیں ان کے مؤثر حل کی کوشش ہونی چاہیے۔ اس کے بعد بعض دوستوں کے ساتھ کھانا ہوا اور رات گئے قصر ناز واپسی ہوئی۔

کراچی میں میرے حقیقی ماموں کا خاندان رہتا ہے۔ ماموں اور ممانی کا انتقال ہو چکا ہے اور اب ان کے بچے ہیں۔ عرصے سے ان سے خط و کتابت نہیں ہے اس لئے ان سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکل سکی جس کا افسوس ہے۔ کراچی پہنچنے کے فوراً ہی بعد سید راشد احمد صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے ادارہ تحقیق و تالیف اسلامی علی گڑھ میں کچھ وقت گزارا ہے۔ مجھ سے ایک طرح کا قلبی تعلق محسوس کرتے ہیں اور اب اسلامک ریسرچ اکیڈمی میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جب تک کراچی میں قیام رہا انہوں نے میرے ساتھ خاصاً وقت گزارا اللہ جزائے خیر دے۔

۲۸ مارچ: آج وطن واپسی تھی۔ صبح 8.40 پر فلائٹ تھی۔ چھ بجے کے قریب

ایئر پورٹ راشد صاحب کے ساتھ پہنچا۔ جہاز وقت پر روانہ ہوا اور ٹھیک ۱۱ بجے پاکستان کی

بہترین یادوں کے ساتھ دہلی واپس ہوا۔ ☆☆☆

تفسیر شاہی

پروفیسر کبیر احمد جانی

تفسیر شاہی کے مختصر حرف آغاز میں اس تفسیر کے مصنف نے اپنا نام ابوالفتح الحسینی تحریر کیا ہے اور اپنے والد، خانوادہ اور وطن کے بارے میں کوئی اطلاع فراہم نہیں کی ہے۔ ابوالفتح الحسینی کے نزدیک کلام پاک کی آیتوں کو چار نوع کی آیتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک نوع کی آیتیں تو وہ ہیں جن میں پیغمبر ﷺ، ائمہ ”محصوین“ اور تمام ”مومنین“ کی مدح و ستائش کی گئی ہے۔ دوسری نوع کی آیتیں وہ ہیں جن میں کفار منافقین اور تمام ”.....“ کے قبائح بیان ہوئے ہیں۔ تیسری نوع کی آیتیں مسائل اور احکام شرعیہ سے متعلق ہیں اور چوتھی نوع کی آیتوں میں ”قصص و امثال لطیفہ شریفہ“ ہیں۔ ابوالفتح الحسینی نے اپنے مقدمہ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان سے پہلے بھی لوگوں نے مسائل و احکام شرعیہ سے متعلق آیتوں کو جمع کر کے ان کی مدد سے ”اصول خمسہ“ کو مرتب انداز سے پیش کیا ہے، مگر چون کہ ان کے پیش روؤں کی تصانیف عربی میں ہیں اور عام افراد ان سے استفادہ نہیں کر سکتے اس لیے وہ شاہ جہماپ کے حکم سے ”آیات احکام“ کی فارسی زبان میں تفسیر لکھ رہے ہیں اور الفاظ و معانی کی تحقیق و تدقیق کر کے ان آیتوں کو اس طرح مرتب کر رہے ہیں کہ ہر شخص ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ چون کہ ابوالفتح الحسینی نے شاہ جہماپ کے حکم پر یہ تفسیر لکھی ہے اس لیے انھوں نے اس کا نام ”تفسیر شاہی“ رکھا ہے۔

عام اردو خواں قاری اس بات سے ناواقف ہے کہ ”آیات الاحکام“ سے

۱۔ ”مسلمین“ اور ”مومنین“ کا ہر ایک سافر لفظ ہے۔

۲۔ یہاں ایک لفظ شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔ ہو سکتا ”ناصین“ ہو ”مومنین“ کا برعکس ”ناصین“ ہی ہو سکتا ہے۔

مراد کس نوع کی تفسیر ہے اور اس کو کس انداز سے مرتب کیا جاتا ہے، اس لیے ہم ذیل میں ”تفسیر شاہی“ کے انداز ترتیب کو بیان کر رہے ہیں۔

ابوالفتح الحسینی نے ایک مختصر سے مقدمہ کے بعد ”تفسیر شاہی“ کی ابتدا ”کتاب طہارت“ سے کی ہے۔ آغاز کلام میں ابوالفتح نے لفظ طہارت کے لغوی معنی بیان کیے ہیں۔ بعد ازاں بارہ آیتوں کی تشریح و تعبیر کرتے ہوئے اپنے نقطہ نظر سے طہارت کے جملہ امور و مسائل پر مفصل اور پر معنی بحث کی ہے۔ ابوالفتح الحسینی نے جن بارہ آیتوں سے مدد لی وہ یہ ہیں۔ (۱) مائدہ ۶ (۲) نساء ۴۳ (۳) البینہ ۵ (۴) واقعہ ۷ (۵) اصل کتاب میں صرف ۹ درج ہے (۵) توبہ ۱۰۸ (اصل آیت کا نصف آخر حصہ) (۶) فرقان ۴۸ (۷) انفال ۱۱ (۸) بقرہ ۲۲۲ (۹) توبہ ۲۸ (۱۰) مائدہ ۹۰ (۱۱) مدثر ۴-۵ (۱۲) بقرہ ۱۲۴

کتاب الطہارۃ کے بعد صفحہ ۹۳ سے کتاب الصلوٰۃ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں بھی پہلے تو صلوٰۃ کے معنی سے بحث کی گئی ہے، بعد ازاں بقول ابوالفتح الحسینی:

”آیات کی متعلق است بہ نماز ہشت نوع است یکی آنکہ متعلق است بہ مطلق نماز و آن چہار آیت است“

[وہ آیتیں جو نماز سے متعلق ہیں آٹھ نوع کی ہیں، ان میں ایک قسم جو مطلق نماز سے متعلق ہے وہ چار آیتیں ہیں]

وہ چار آیتیں یہ ہیں: (۱) نساء ۱۰۳ (۲) بقرہ ۱۳۸ (۳) طہ ۱۳۲ (۴) مومنون ۱ نوع دوم ”(آیات مست)“ کہ دلالت می کند بر وجوب نماز ہائی پنج گانہ و تعیین اوقات ایشان و آن پنج آیت است“

[دوسری نوع کی] وہ آیتیں ہیں جو پانچوں وقت کی نمازوں کے وجوب اور ان کے اوقات کی تعیین پر دلالت کرتی ہیں، ایسی آیتیں پانچ ہیں]

وہ پانچ آیتیں یہ ہیں (۱) بنی اسرائیل ۷۹ (۲) ہود ۱۱۳ (۳) روم ۱۷ (۴) طہ ۱۳۰ (۵) ق ۳۹۔